بارش کی آواز
امجد اسلام امجد

ترتیب

پنجابی کلام

سات سمندر پار سے (تراجم)

زندگی کی طرح بارش کے بھی بے شمار رُوپ ہیں۔ میں غالب کی طرح گردشِ سیارہ کی آواز تک تو رسائی حاصل نہیں کر سکا مگر بارش کی مختلف آوازوں نے زندگی بھر مجھے اپنے جادُو کا اسیر رکھا ہے میں نے ان آوازوں کو پہاڑوں، میدانوں، ریگستانوں، برف زاروں، شہروں، ویرانوں، ہنگاموں اور تنہائی میں بہت دفعہ سُنا ہے۔ کبھی کبھی یہ آوازیں اور ان کے سُر جب اندر کے موسموں سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو زندگی اپنے کچھ ایسے اسراروں سے پردہ اُٹھاتی ہے جنھیں صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے کہ کیفیات کے اظہار میں لفظ بعض اوقات گونگے کے اشاروں سے بھی زیادہ مبہم ہو جاتے ہیں۔

بارش کا رومانیت سے کیا تعلق ہے؟ انسان کی رُوح، نفسیات، سماعت اور باطنی کیفیات سے اس کے رشتے کس بنیاد پر استوار ہوتے ہیں؟ اور بارش کی آواز کھڑکیوں کے شیشوں، درختوں کے پتّوں اور چھتوں کی منڈیروں سے ہوتی ہُوئی کس طرح وجُود کے صنم کدے میں بُت تراشیاں کرتی ہے اور کیسے بارش میں بھیگ کر مٹی کی سوندھی خوشبو مساموں میں اُترتی چلی جاتی ہے؟ میرے پاس اس کی وضاحت کے لیے کوئی عقلی یا سائنسی دلیل نہیں میں تو بس اِتنا جانتا ہُوں کہ بارش اور اس کی آواز میرے لیے فطرت کے حسین ترین تحفے ہیں۔ "برزخ" سے لے کر "اتنے خواب کہاں رکھوں گا" تک کی نظموں میں آپ نے بارش اور اُس کے متعلقات کو مختلف تمثالوں، پیرایوں، رنگوں اور کیفیات کے حوالے سے دیکھا ہوگا۔ یہ کتاب بھی اُسی تسلسل

کی ایک کڑی ہے اور اس کا نام گویا ایک قرض تھا جسے ادا کرنا واجب تھا کہ ہر
خوبصورت تعلق اپنا اظہار بھی چاہتا ہے ۔

مجھے یقین ہے کہ پروین شاکر اگر آج زندہ ہوتی تو اس نام کو سُن کر بہت
خوش ہوتی کہ " بارش " اُس کی بھی بہت بڑی کمزوری تھی ۔ کیا عجیب اور لرزا دینے
والا تصور ہے کہ اُس کی قبر پر برسنے والی ہر بارش کے ساتھ ساتھ اُس کے لیے رونے
والی آنکھوں سے آنسو کم سے کم ہوتے چلے جا رہے ہیں ۔ اس کتاب میں اس کی وفات
پر لکھی ہوئی ایک نظم بھی شامل ہے ۔ ایک اور ماتمی نظم میرے عزیز دوست دلدار پرویز
بھٹی کے حوالے سے ہے ۔ یوں تو ان دونوں کی یاد ایک خوشبو کی طرح سدا میرے
آس پاس رہتی ہے لیکن بارشوں کے موسم میں تو کبھی کبھی میں نے سچ مچ اُن کی آوازیں
بھی سُنی ہیں ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مرنے والوں کی آوازیں بارش کی آواز میں دوبارہ زندہ
ہو جاتی ہوں ! یا شاید پیچھے رہ جاتی ہوں کہ خاک میں صورتیں تو پنہاں ہو جاتی
ہیں لیکن ......

اِس کتاب کے آخر میں میں نے کم و بیش اپنا تمام پنجابی کلام جمع کر دیا ہے اور
سچی بات ہے کہ اِس کے انتہائی مختصر حجم کو دیکھ کر مجھے اندر ہی اندر کچھ ندامت بھی
محسوس ہو رہی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو زبان میری قومی، تعلیمی اور ادبی
زبان ہے اور میرا بنیادی تعارف بھی اُردو شاعر اور ادیب کا ہے لیکن اپنی مادری زبان کا
قرض مجھ پر ابھی تک واجب ہے ۔ سو یہ چند چیزیں محض اسی احساسِ ندامت کو کم
کرنے اور اس بات کا اظہار کرنے کے لیے شامل کی جا رہی ہیں کہ اس کوتاہی کی بہت
سی وجوہات میں کم از کم پنجابی کے بارے میں کوئی احساسِ کمتری یا معذرت خواہی شامل

نہیں ہے ۔

کئی برس قبل میں نے دو انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا ۔ اتفاق سے
یہ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکیں ، سو انھیں بھی کتاب کے آخر میں اس خیال
سے شامل کر دیا گیا ہے کہ اِس طرح یہ محفوظ تو ہو ہی جائیں گی ۔ عین ممکن ہے کہ کچھ
قارئین انھیں اپنے دل اور ذوق سے بھی قریب تر پائیں ۔ وارث شاہ نے ہیر کے
حُسن و جمال کا نقشہ پنجابی زبان میں جس خوبی اور مہارت سے کھینچا ہے وہ تو اپنی مثال
آپ ہے ہی لیکن مارلو نے ہیلن آف ٹرائے کے حُسن کو بزبانِ انگریزی جس فن کاری سے
بیان کیا ہے اس کی داد نہ دینا بھی ناانصافی ہو گی ۔ چند برس قبل میں نے پنجابی کے عظیم
ڈرامہ نگار اور اپنے مہربان بزرگ دوست سجاد حیدر مرحوم کے ایک اُردو افسانے کے
لیے اُن کی فرمائش پر اس شہ پارے کی کچھ لائنیں ترجمہ کی تھیں اُنھیں بھی " ہیلن "
کے عنوان سے درج کر دیا گیا ہے ۔

برادرِ عزیز شمیم اختر سیفی غالب کے کم معروف مگر اعلیٰ اشعار کی بازیافت
کے ماہر ہیں ، گزشتہ چند دنوں سے اُن کا سنایا ہُوا ایک شعر دھیان سے چمٹا ہُوا
ہے ۔ آپ بھی سُن لیجیے :

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کے شایاں یہی ویرانہ تھا

۹-بی / جی ۔ او ۔ آر III
شادمان ۔ لاہور

امجد اسلام امجد

خزاں کی شام کو صُبحِ بہار تُو نے کیا
مِرے خُدا ، مِرے پروردگار تُو نے کیا

میں یُونہی خاک کی پستی میں ڈولتا رہتا
ترا کرم کہ مجُھے استوار تُو نے کیا

مِرے لہُو میں رکھے اپنی خلوتوں کے راز
پھر اس کے بعد مجُھے بے قرار تُو نے کیا

خَطا کے بعد خَطا ، پے بہ پے ہُوئی مجُھ سے
معاف مجُھ کو مگر بار بار تُو نے کیا

شبیہہ اپنی بنا دی ہماری آنکھوں میں
پھر ان کو وقفِ رہِ انتظار تُو نے کیا

جُھلستی ریت میں اُگنے لگے ہیں پُھول ہی پُھول
کرم جو مجُھ پہ کیا بے شُمار تُو نے کیا

(ق)

مری رسائی میں رکھ دی خلا کی پہنائی
میں گردِ رہ تھا مجھے شہ سوار تُو نے کیا

مرے وُجود سے لپٹے تھے تفرقے کیا کیا
میں آبجو تھا مجھے بے کنار تُو نے کیا

میں ایک ذرّہ ریگِ رواں تھا صحرا میں
مجُھے ثبات دیا ، کوہسار تُو نے کیا

ہَوا خلاف تھی موسم کا ذائقہ تھا تلخ
ہر ایک شے کو مگر خُوش گوار تُو نے کیا

چلا جو مَیں ترے رستے پہ، میرے صحرا کو
اُمنڈتے اَبر دیئے ، مرغزار تُو نے کیا

بنائی پہلے تو یہ کائنات چاروں طرف
پھر اس کے بعد مجھے آشکار تُو نے کیا

مرے قلم پہ ہُوئی جس گھڑی ، نظر تیری
مرے سخن کو، مجھے، ذی وقار تُو نے کیا

نعت

سخن کے نُور سے کردار کے اُجالے سے
یہ کائنات بنی ہے ترے حوالے سے

بس ایک دستِ کرم نے مٹا دیئے یکسر
دلوں کے بیچ تھے جو تفرقوں کے جالے سے

ہر ایک تخت سے بالا ہے بوریا جس کا
ہمیں ہے کام اُسی دو جہان والے سے

ترے جمال کا یوں عکس ہیں ترے اصحاب
کہ جیسے چاند کا رشتہ ہے اپنے ہالے سے

رواں رہیں گے اَبد تک دِلوں کے میخانے
تری نظر کے سُبو سے عطا کے پیالے سے

وہ جس کا ذائقہ رُوحیں اُجاڑ دیتا ہے
ترا کرم کہ رکھّا دُور اُس نوالے سے

عجب ہے شہرِ محمدؐ کی آرزو امجد
کہ میرا دِل تو سنبھلتا نہیں سنبھالے سے

نعتیہ نظم

یہ جو بے رنگ سی، بے آب سی آتی ہے نظر
اِسی مٹّی پہ پڑا کرتے تھے وہ نُور قدم
جن کی آہٹ کا تسلسل ہے یہ سارا عالم
جن کی خوشبو میں ہرے رہتے ہیں دل کے موسم
جس کی حیرت سے بھرے رہتے ہیں خوابوں کے نگر

وہ جو اِک تنگ سا رستہ ہے حرا کی جانب
اُس کے پھیلاؤ میں کونین سمٹ جاتے ہیں
آنکھ میں چاروں طرف رنگ سے لہراتے ہیں
پاؤں خُود جس کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں
یہی جادہ ہے جو جاتا ہے خُدا کی جانب

کِتنی صدیوں سے مسلّط تھا کوئی شک مجُھ پر
اپنے ہونے کی گواہی بھی نہیں ملتی تھی
حبس ایسا تھا کوئی شاخ نہیں ہلتی تھی!
اک کلی ایسی نہیں تھی جو نہیں کِھلتی تھی
جب کھُلی شانِ "رفعنا لکَ ذِکرک" مجھ پر

آپ کا نقشِ قدم میرا سہارا بن جائے!
بادِ رحمت کا اشارا ہو سفینے کی طرف
وہ جو اِک راہ نکلتی ہے مدینے کی طرف
اُس کی منزل کا نشاں ہو مِرے سینے کی طرف
مِرے رستے کا ہر اک سنگ، ستارا بن جائے!!

تمھیں مجھ سے محبّت ہے

محبّت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے!
کہ یہ جتنی پرانی جتنی بھی مضبوط ہو جائے
اِسے تائیدِ تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے

یقیں کی آخری حد تک دِلوں میں لہلہاتی ہو!
نگاہوں سے ٹپکتی ہو ، لہُو میں جگمگاتی ہو!
ہزاروں طرح کے دلکش، حسیں ہالے بناتی ہو!
اِسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے

محبّت مانگتی ہے یوں گواہی اپنے ہونے کی
کہ جیسے طفلِ سادہ شام کو اِک بیج بوئے
اور شب میں بارہا اُٹھے
زمیں کو کھود کر دیکھے کہ پودا اب کہاں تک ہے!
محبّت کی طبیعت میں عجب تکرار کی خُو ہے
کہ یہ اقرار کے لفظوں کو سُننے سے نہیں تھکتی
بچھڑنے کی گھڑی ہو یا کوئی ملنے کی ساعت ہو
اسے بس ایک ہی دُھن ہے
کہو ــــ "مجھ سے محبّت ہے"
کہو ــــ "مجھ سے محبّت ہے"

تمھیں مجھ سے محبّت ہے
سمندر سے کہیں گہری، ستاروں سے سوا روشن
پہاڑوں کی طرح قائم، ہَواؤں کی طرح دائم

زمیں سے آسماں تک جس قدر اچھے مناظر ہیں
محبّت کے کنائے ہیں، وفا کے استعارے ہیں
ہمارے ہیں۔
ہمارے واسطے یہ چاندنی راتیں سنورتی ہیں
سُنہرا دن نِکلتا ہے
محبّت جس طرف جائے، زمانہ ساتھ چلتا ہے"

(۲)

کچُھ ایسی بے سکُونی ہے وفا کی سرزمینوں میں
کہ جو اہلِ محبّت کو سدا بے چین رکھتی ہے
کہ جیسے پھُول میں خُوشبو، کہ جیسے ہاتھ میں پارا
کہ جیسے شام کا تارا
محبّت کرنے والوں کی سحر راتوں میں رہتی ہے
گُماں کے شاخچوں میں آشیاں بنتا ہے اُلفت کا!
یہ عینِ وصل میں بھی ہجر کے خدشوں میں رہتی ہے

محبّت کے مُسافر زندگی جب کاٹ چُکتے ہیں
تھکن کی کرچیاں چُنتے، وفا کی اَجرکیں پہنے
سمے کی رہگزر کی آخری سرحد پہ رُکتے ہیں
تو کوئی ڈوبتی سانسوں کی ڈوری تھام کر
دھیرے سے کہتا ہے،

"یہ سچ ہے نا ____!
ہماری زندگی اِک دُوسرے کے نام لکھّی تھی!
دُھندلکا سا جو آنکھوں کے قریب و دُور پھیلا ہے
اِسی کا نام چاہت ہے!
تمھیں مجُھ سے محبّت تھی
تمھیں مُجھ سے محبّت ہے!!"

محبّت کی طبیعت میں
یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھّا ہے!

وہ فقط میرا ہی دِلدار نہ تھا

(دِلدار بھٹی کے لیے ایک نظم)

کِس کا ہمدرد نہ تھا، دوست نہ تھا، یار نہ تھا
وہ فقط میرا ہی دلدار نہ تھا

قہقہے بانٹتا پھرتا تھا گلی کُوچوں میں
اپنی باتوں سے سبھی دَرد بُھلا دیتا تھا
اُس کی جیبوں میں بھرے رہتے تھے سکّے، غم کے
پھر بھی ہر بزم کو گلزار بنا دیتا تھا۔

ہر دُکھی دل کی تڑپ
اُس کی آنکھوں کی لہو رنگ فضا میں گھُل کر
اُس کی راتوں میں سُلگ اُٹھتی تھی

میری اور اُس کی رفاقت کا سفر
ایسے گزُرا ہے کہ اب سوچتا ہُوں
یہ جو پچّیس برس
آرزو رنگ ستاروں کی طرح لگتے تھے
کیسے آنکھوں میں اُتر آئے ہیں آنسو بن کر!
اُس کو روکے گی کسی قبر کی مٹی کیسے!
وہ تو منظر میں بکھر جاتا تھا خُوشبو بن کر!
اُس کا سینہ تھا مگر پیار کا دریا کوئی
ہر دُکھی رُوح کو سیراب کیے جاتا تھا
نام کا اپنے بھرم اُس نے کچُھ ایسے رکھا
دلِ احباب کو مہتاب کیے جاتا تھا

کوئی پھل دار شجر ہو سرِ راہ ہے، جیسے
کسی بدلے، کسی نسبت کا طلبگار نہ تھا
اپنی نیکی کی مسرّت تھی، اثاثہ اُس کا
اُس کو کچھ اہلِ تجارت سے سروکار نہ تھا

کس کا ہمدرد نہ تھا، دوست نہ تھا، یار نہ تھا
وہ فقط میرا ہی دلدار نہ تھا۔

○

جو دیکھنے کا تمھیں اہتمام کرتے ہیں
زمیں سے جُھک کے ستارے کلام کرتے ہیں

تو آؤ آج سے ہم ایک کام کرتے ہیں
وفا کے نام سبھی صبح و شام کرتے ہیں

یہ راستہ ہے مگر ہجرتی پرندوں کا
یہاں سمے کے مُسافر قیام کرتے ہیں

وفا کی قبر پہ کب تک اِسے جلا رکھیں
سو یہ چراغ ہواؤں کے نام کرتے ہیں

کبھی جو بام پہ ٹھہرے تو چاند رُک جائے
غزال دیکھ کے اُس کو خرام کرتے ہیں

(ق)

یہ اہلِ دَرد کی بستی ہے، زرگروں کی نہیں
یہاں دِلوں کا بہت احترام کرتے ہیں

جہاں پناہوں کی جانب نظر نہیں کرتے
غریبِ شہر کو جُھک کر سلام کرتے ہیں

ہے اِن کی چشمِ توجّہ میں روشنی ایسی
کہ جیسے اِس میں ستارے قیام کرتے ہیں

یہاں پہ سِکّۂ اہلِ ریا نہیں چلتا
کہ اہلِ دَرد نظر سے کلام کرتے ہیں

یہ حق پرست ہیں کیسے عجیب سوداگر
فنا کی آڑ میں کارِ دوام کرتے ہیں

جہاں جہاں پہ گرا ہے لہو شہیدوں کا
وہاں وہاں پہ فرشتے سلام کرتے ہیں

نہ گھر سے اِن کو ہے نسبت نہ کوئی نام سے کام
دِلوں میں بستے، نظر میں مقام کرتے ہیں

رواجِ اہلِ جہاں سے انھیں نہیں مطلب
کہ یہ تو رسمِ محبّت کو عام کرتے ہیں

جہاں میں ہوتے ہیں ایسے بھی کچھ ہُنر والے
جو اِک نگاہ میں امجدؔ غلام کرتے ہیں

تیرے میرے خواب

آسمان کے چاند اور تارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں !
یہ جو فرشِ خاک پہ بکھرا ریزہ ریزہ آئینہ ہے
اِس میں جتنے عکس ہیں، سارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں!

دیر رہیں جو آنکھوں میں تو خواب پرندے بن جاتے ہیں
لاکھ انھیں آزاد کرو یہ پھر کر واپس آ جاتے ہیں
یہ جو قفس کے دروازے میں پَر پھیلائے بیٹھے ہیں
یہ درماندہ ، اوگن ہارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں !

پلکوں کی دہلیز سے لگ کر دیکھ رہے ہیں رستوں کو
مِٹتی بنتی شکلوں کو اور جلتے بُجھتے رنگوں کو
بوجھل چُپ اور اوجھل دُکھ کے سائے سائے بیٹھے ہیں
یہ بے چہرہ اور بے چارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں !

بحرِ فنا میں مِل جانے تک ملنے سے مجبور بھی ہیں
اِک دُوجے کے ساتھ بھی ہیں اور اِک دُوجے سے دُور بھی ہیں
لمحوں کے گرداب سفر میں جو چکرائے بیٹھے ہیں
یہ دونو ـــــ دریا کے کنارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں !!

○

حسابِ عُمر کا اِتنا سا گوشوارا ہے
تمھیں نکال کے دیکھا تو سب خسارا ہے

کسی چراغ میں ہم ہیں، کسی کنول میں تُم
کہیں جمال ہمارا کہیں تمھارا ہے

وہ کیا وصال کا لمحہ تھا جس کے نشّے میں
تمام عُمر کی فرقت ہمیں گوارا ہے

ہر اک صدا جو ہمیں بازگشت لگتی ہے
نجانے ہم ہیں دوبارا کہ یہ دوبارا ہے

وہ منکشف مِری آنکھوں میں ہو کہ جلوے میں
ہر ایک حُسن کسی حُسن کا اشارا ہے

عجب اُصول ہیں اِس کاروبارِ دُنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اُتارا ہے

کہیں یہ ہے کوئی خوشبو کہ جس کے ہونے کا
تمام عالمِ موجود، استعارا ہے

نجانے کب تھا! کہاں تھا! مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کبھی گزارا ہے

یہ دو کنارے تو دریا کے ہو گئے، ہم تم!
مگر وہ کون ہے جو تیسرا کنارا ہے!

ایک عجیب خیال

کسی پرواز کے دوران اگر
اِک نظر ڈالیں جو
کھڑکی سے اُدھر
دُور، تاحدِّ نگہ
ایک بے کیف سی یکسانی میں ڈوبے منظر
محوِ افسوس نظر آتے ہیں
کسی انجان سے نشّے میں بھٹکتے بادل
اور پھر اُن کے تلے
بحر و بر، کوہ و بیابان و دَمن
جیسے مدہوش نظر آتے ہیں
شہر خاموش نظر آتے ہیں

شہر خاموش نظر آتے ہیں لیکن ان میں
سینکڑوں سڑکیں ہزاروں ہی گلی کُوچے ہیں
اور مکاں — ایک دُوجے سے جُڑے
ایسے محتاط کھڑے ہیں جیسے
ہاتھ چھُوٹا تو ابھی،
گِر کے ٹوٹیں گے، بِکھر جائیں گے۔
اِس قدر دُور سے کچھ کہنا ذرا مشکل ہے
اِن مکانوں میں، گلی کُوچوں، گُزرگاہوں میں
یہ جو کچھ کیڑے مکوڑے سے نظر آتے ہیں
کہیں اِنساں تو نہیں!
وہی انساں — جو تکبّر کے صنم خانے میں
ناخُدا اور خُدا، آپ ہی بن جاتا ہے
پاؤں اِس طرح سرِ فرشِ زمیں رکھتا ہے
وُہی خالق ہے ہر اِک شے کا، وُہی داتا ہے

اِس سے اب کون کہے !
اے سرِ خاکِ فنا رینگنے والے کیڑے !
یہ جو مستی ہے تجھے ہستی کی
اپنی دہشت سے بھری بستی کی
اس بلندی سے کبھی آن کے دیکھے تو کھُلے
کیسی حالت ہے تری پستی کی!
اور پھر اُس کی طرف دیکھ کہ جو
ہے زمانوں کا، جہانوں کا خُدا
خالقِ اَرض و سما، حیّ و صمد
جس کے دروازے پہ رہتے ہیں کھڑے
مثلِ دربان، اَزل اور اَبد
جس کی رفعت کا ٹھکانہ ہے نہ حدّ۔
اور پھر سوچ اگر
وہ کبھی دیکھے تجھے !!!

کوئی چاند چہرا کُشا ہُوا

کوئی چاند چہرا کُشا ہُوا
وہ جو دُھند تھی وہ بِکھر گئی
وہ جو حَبس تھا وہ ہَوا ہُوا

کوئی چاند چہرا کُشا ہُوا
تو سمٹ گئی
وہ جو تیرگی تھی چہار سُو
وہ جو برف ٹھہری تھی رُوبرُو
وہ جو بے دِلی تھی صدف صدف
وہ جو خاک اُڑتی تھی ہر طرف۔

مگر اک نگاہ سے جل اُٹھے
جو چراغِ جاں تھے بُجھے ہُوئے
مگر اک سخن سے مہک اُٹھے
مرے گُلستاں، مرے آئنے
کسی خُوش نظر کے حصار میں
کسی خُوش قدم کے جوار میں

کوئی چاند چہرا کُشا ہُوا
مرا سارا باغ ھرا ہُوا

پروین کے "گیتو" کے لیے ایک نظم

ہاں مری جان، مرے چاند سے خواہرزادے!
بُجھ گئیں آج وہ آنکھیں کہ جہاں
تیرے سپنوں کے سوا کُچھ بھی نہ رکھا اُس نے،
کتنے خوابوں سے، سرابوں سے اُلجھ کر گزری
تب کہیں تجھ کو، ترے پیار کو پایا اُس نے
تو وہ "خُوشبو" تھا کہ جس کی خاطر
اُس نے اِس باغ کی ہر چیز سے "انکار" کیا
دشتِ "صد برگ" میں وہ خُود سے رہی محوِ کلام
اپنے رنگوں سے تری راہ کو گلنار کیا

اے مری بہن کے ہر خواب کی منزل "گیتو"
رونقِ "ماہِ تمام"
سو گیا آج وہ اِک ذہن بھی مٹی کے تلے
جس کی آواز میں مہتاب سفر کرتے تھے
شاعری جس کی اثاثہ تھی جواں جذبوں کا
جس کی توصیف سبھی اہلِ ہُنر کرتے تھے

ہاں مری جان، مرے چاند سے خواہرزادے
وہ جسے قبر کی مٹّی میں دبا آئے ہیں
وہ تری ماں ہی نہ تھی
پُورے اِک عہد کا اعزاز تھی وہ
جس کے لہجے سے مہکتا تھا یہ منظر سارا
ایسی آواز تھی وہ
کس کو معلوم تھا "خوشبو" کے سفر میں جس کو
مسئلہ پھُول کا بے چین کیے رکھتا ہے

اپنے دامن میں لیے
کُو بکُو پھیلتی اِک بات شناسائی کی
اِس نمائشِ گہِ ہستی سے گزر جائے گی
دیکھتے دیکھتے مٹی میں اُتر جائے گی
ایسے چُپ چاپ بکھر جائے گی۔

○

اے گردشِ حیات کبھی تو دِکھا وہ نیند
جس میں شبِ وصال کا نشّہ ہو، لا وہ نیند

ہرنی سی ایک آنکھ کی مستی میں قید تھی
اِک عمر جس کی کھوج میں پھرتا رہا، وہ نیند

پھُوٹیں گے اَب نہ ہونٹ کی ڈالی پہ کیا گلاب!
آئے گی اب نہ لَوٹ کے آنکھوں میں کیا، وہ نیند!

کچھ رُت جگے سے جاگتی آنکھوں میں رہ گئے
زنجیرِ انتظار کا تھا سلسلہ، وہ نیند

دیکھا کچھ اِس طرح سے کسی خُوش نگاہ نے
رُخصت ہُوا تو ساتھ ہی لیتا گیا وہ، نیند

خُوشبو کی طرح مجھ پہ جو بکھری تمام شب
میں اُس کی مست آنکھ سے چُنتا رہا، وہ نیند

گھُومی ہے رتجگوں کے نگر میں تمام عُمر
ہر رہگذارِ درد سے ہے آشنا، وہ نیند

تُو جس کے بعد حشر کا میلہ سجائے گا!
میں جس کے انتظار میں ہُوں، اے خُدا، وہ نیند!

امجد ہماری آنکھ میں لَوٹی نہ پھر کبھی
اُس بے وفا کے ساتھ گئی بے وفا، وہ نیند

...... کئی سال ہو گئے

خوابوں کی دیکھ بھال میں آنکھیں اُجڑ گئیں
تنہائیوں کی دُھوپ نے چہرے جلا دیئے
لفظوں کے جوڑنے میں عبارت بکھر چلی
آئینے ڈھونڈنے میں کئی عکس کھو گئے
آئے نہ پھر وہ لوٹ کے، اِک بار جو گئے

ہر رہگذر میں بھیڑ تھی لوگوں کی اِس قدر
اِک اجنبی سے شخص کے مانوس خدّوخال
ہاتھوں سے گِر کے ٹوٹے ہُوئے آئنہ مثال
جیسے تمام چہروں میں تقسیم ہو گئے
اِک کہکشاں میں لاکھ ستارے سمو گئے

وہ دن، وہ رُت، وہ وقت، وہ موسم، وہ سرخوشی
اے گردشِ حیات، اے رفتارِ ماہ و سال!
کیا جمع اس زمیں پہ نہیں ہوں گے پھر کبھی؟
جو ہم سفر فراق کی دَلدل میں کھو گئے
پتّے جو گر کے پیڑ سے رستوں کے ہو گئے

کیا پھر کبھی نہ لوٹ کے آئے گی وہ بہار!
کیا پھر کبھی نہ آنکھ میں اُترے گی وہ دھنک!
جس کے وَفورِ رنگ سے چھلکی ہُوئی ہَوا
کرتی ہے آج تک
اِک زُلف میں سجے ہُوئے پھولوں کا انتظار!

لمحے زمانِ ہجر کے، پھیلے کچھ اِس طرح
ریگِ روانِ دشت کی تمثال ہو گئے

اس دشتِ پُرسراب میں بھٹکے ہیں اس قدر
نقشِ قدم تھے جتنے بھی، پامال ہو گئے
اب تو کہیں پہ ختم ہو رستہ گُمان کا!
شیشے میں دل کے سارے یقیں، بال ہو گئے
جس واقعے نے آنکھ سے چھینی تھی میری نیند
اُس واقعے کو اب تو کئی سال ہو گئے!!

ہَوا بُرد

مرے ہم سَفر
مرے جسم و جاں کے ہر ایک رشتے سے معتبر، مرے ہم سَفر
تجھے یاد ہیں! تجھے یاد ہیں!
وہ جو قربتوں کے سُرور میں
تری آرزو کے حصار میں
مری خواہشوں کے وفور میں
کئی ذائقے تھے گھُلے ہُوئے
درِ گلستاں سے بہار تک
وہ جو راستے تھے، کھُلے ہُوئے!

سرِ لوحِ جاں ،
کسی اجنبی سی زبان کے
وہ جو خوشنما سے حروف تھے !
وہ جو سرخوشی کا غبار سا تھا چہار سُو
جہاں ایک دُوجے کے رُوبرو
ہمیں اپنی رُوحوں میں پھیلتی کسی نغمگی کی خبر ملی
کسی روشنی کی نظر ملی ،
ہمیں روشنی کی نظر ملی تو جو ریزہ ریزہ سے عکس تھے
وہ بہم ہُوئے
وہ بہم ہُوئے تو پتہ چلا
کہ جو آگ سی ہے شرر فشاں مری خاک میں
اُسی آگ کا
کوئی اَن بُجھا سا نشان ہے، تری خاک میں !
اسی خاکداں میں وہ خواب ہے
جسے شکل دینے کے واسطے

یہ جو شش جہات کا کھیل ہے یہ رواں ہُوا
اسی روشنی سے "مکاں" بنا ، اسی روشنی سے "زماں" ہُوا
یہ جو ہر گُماں کا یقین ہے !
وہ جو ہر یقیں کا گمان تھا !
اسی داستاں کا بیان تھا !

(۲)

کسی دھیان کے، کسی طاق پر، ہے دھرا ہُوا
وہ جو ایک رشتۂ درد تھا
مرے نام کا ترے نام سے ،
تری صبح کا مری شام سے،
سرِ رہگذر ہے پڑا ہُوا وہی خوابِ جاں
جسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے واسطے
کئی لاکھ تاروں کی سیڑھیوں سے اُتر کے آتی تھی کہکشاں،
سرِ آسماں

کسی اَبر پارے کی اوٹ سے
اُسے چاند تکتا تھا رات بھر
مرے ہم سفر
اُسی رخصتِ غم کو سمیٹتے
اُسی خوابِ جاں کو سنبھالتے
مرے راستے، کئی راستوں میں اُلجھ گئے
وہ چراغ جو مرے ساتھ ساتھ تھے، بُجھ گئے
وہ جو منزلیں
کسی اور منزلِ بے نشاں کے غبارِ راہ میں کھو گئیں
(کئی وسوسوں کے فشار میں شبِ انتظار سی ہوگئیں)
وہ طنابِ دل جو اُکھڑ گئی
وہ خیامِ جاں جو اُجڑ گئے
وہ سفیر تھے، اُسی داستانِ حیات کے
جو وَرق وَرق تھی بھری ہُوئی
مرے شوق سے ترے روپ سے

کہیں چھاؤں سے، کہیں دھوپ سے

(۳)

مرے ہم سفر، تجھے کیا خبر!
یہ جو وقت ہے کسی دُھوپ چھاؤں کے کھیل سا
اِسے دیکھتے، اِسے جھیلتے
مری آنکھ گرد سے اَٹ گئی
مرے خواب ریت میں کھو گئے
مرے ہاتھ برف سے ہو گئے
مرے بے خبر، ترے نام پر
وہ جو پھُول کھِلتے تھے ہونٹ پر
وہ جو دیپ جلتے تھے بام پر،
وہ نہیں رہے
وہ نہیں رہے کہ جو ایک ربط تھا درمیاں وہ بکھر گیا
وہ ہَوا چلی

کسی شام ایسی ہَوا چلی
کہ جو برگ تھے سرِ شاخِ جاں، وہ گرا دیئے
وہ جو حرف درج تھے ریت پر، وہ اُڑا دیئے
وہ جو راستوں کا یقین تھے
وہ جو منزلوں کے امین تھے
وہ نشانِ پا بھی مِٹا دیئے!
مرے ہم سفر، ہے وہی سفر
مگر ایک موڑ کے فرق سے
ترے ہاتھ سے مرے ہاتھ تک
وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
کئی موسموں میں بدل گیا
اُسے ناپتے، اُسے کاٹتے
مرا سارا وقت نکل گیا
تو مِرے سفر کا شریک ہے
میں ترے سفر کا شریک ہوں

پہ جو درمیاں سے نکل گیا
اُسی فاصلے کے شمار میں
اُسی بے یقیں سے غبار میں
اُسی رہگزر کے حصار میں
ترا راستہ کوئی اور ہے
مرا راستہ کوئی اور ہے۔

دِل کے آتشدان میں شب بھر

دل کے آتشدان میں شب بھر
کیسے کیسے غم جلتے ہیں !
نیند بھرا سنّاٹا جس دَم
بستی کی ایک ایک گلی میں
کھڑکی کھڑکی تھم جاتا ہے
دیواروں پر دَرد کا کہرا جم جاتا ہے
رستہ تکنے والی آنکھیں اور قندیلیں بجھ جاتی ہیں

تو اُس لمحے ،
تیری یاد کا ایندھن بن کر
شعلہ شعلہ ہم جلتے ہیں
دُوری کے موسم جلتے ہیں ۔

تُم کیا جانو ،
قطرہ قطرہ دل میں اُترتی اور پگھلتی
رات کی صحبت کیا ہوتی ہے !

"آنکھیں سارے خواب بُجھا دیں
چہرے اپنے نقش گنوا دیں
اور آئینے عکس بُھلا دیں
ایسے میں اُمّید کی وحشت
درد کی صُورت کیا ہوتی ہے !

ایسی تیز ہوا میں پیارے ،
بڑے بڑے منہ زور دیئے بھی کم جلتے ہیں
لیکن پھر بھی ہم جلتے ہیں
ہم جلتے ہیں اور ہمارے ساتھ تمھارے غم جلتے ہیں
دل کے آتشدان میں شب بھر
تیری یاد کا ایندھن بن کر
ہم جلتے ہیں ۔

ہم لوگ نہ تھے ایسے

ہیں جیسے نظر آتے
اے وقت گواہی دے
ہم لوگ نہ تھے ایسے
یہ شہر نہ تھا ایسا
یہ روگ نہ تھے ایسے

دیوار نہ تھے رستے ـــ زندان نہ تھی بستی
آزار نہ تھے رشتے ـــ خلجان نہ تھی ہستی
یوں موت نہ تھی سستی!

یہ آج جو صُورت ہے — حالات نہ تھے ایسے
یوں غیر نہ تھے موسم — دن رات نہ تھے ایسے

تفریق نہ تھی ایسی
سنجوگ نہ تھے ایسے
اے وقت گواہی دے
ہم لوگ نہ تھے ایسے

○

اہلِ نظر کی آنکھ میں تاج و کلاہ کیا !
سایا ہو جن پہ دَرد کا ، اُن کو پناہ کیا ؟

ٹھہرا ہے اِک نگاہ پہ سارا مقدّمہ
کیسے وکیل ! کون سا مُنصف ! گواہ کیا !

کرنے لگے ہو آٹھوں پہر کیوں خُدا کو یاد ؟
اُس بُت سے ہو گئی ہے کوئی رسم و راہ کیا ؟

اے ربِّ عدل تُو مری فردِ عمل کو چھوڑ
بس یہ بتا کہ اِس میں ہے میرا گُناہ کیا ؟

سارے فراق سال دُھواں بن کے اُڑ گئے
ڈالی ہمارے حال پہ اُس نے نگاہ کیا !

کیا دل کے بعد آبروئے دِل بھی رُول دیں
دکھلائیں اُس کو جا کے یہ حالِ تباہ کیا ؟

جو جتنا کم بساط ہے، اُتنا ہے معتبر
یارو یہ اہلِ فقر کی ہے بارگاہ، کیا !

کیسے کہیں کہ کر گئی اِک ثانیے کے بیچ
جادُو بھری وہ آنکھ، وہ جھُکتی نگاہ کیا !

(ق)

وہ بربنائے جبر ہو یا اقتضائے صبر
ہر بُوالہوس سے کرتے رہو گے نباہ کیا ؟
ہر شے کی مثل ہو گی کوئی بے کسی کی حد !
اِس شہرِ بے ہُنر کا ہے دِن بھی سیاہ کیا ؟

رستے میں تھیں غنیم کے پھُولوں کی پتّیاں
سالار بک گئے تھے تو کرتی سپاہ کیا !

دِل میں کوئی اُمّید نہ آنکھوں میں روشنی
نکلے گی اِس طرح کوئی جینے کی راہ کیا ؟

امجد نزولِ شعر کے کیسے بنیں اُصول !
سیلاب کے لیے کوئی ہوتی ہے راہ کیا ؟

آنے والا کل

نصف صدی ہونے کو آئی
میرا گھر اور میری بستی
ظُلم کی اندھی آگ میں جل جل راکھ میں ڈھلتے جاتے ہیں
میرے لوگ اور میرے بچّے
خوابوں اور سرابوں کے اِک جال میں اُلجھے
کٹتے، مرتے، جاتے ہیں
چاروں جانب ایک لہو کی دَلدل ہے
گلی گلی تعزیر کے پہرے، کوچہ کوچہ مقتل ہے

اور یہ دُنیا ـــــ !
عالمگیر اُخوّت کی تقدیس کی پہرے دار یہ دُنیا
ہم کو جلتے، کٹتے، مرتے،
دیکھتی ہے اور چُپ رہتی ہے
زور آور کے ظلم کا سایا پَل پَل لمبا ہوتا ہے
وادی کی ہر شام کا چہرہ خُون میں لتھڑا ہوتا ہے

لیکن یہ جو خونِ شہیداں کی شمعیں ہیں
جب تک اِن کی لَویں سلامت !
جب تک اِن کی آگ فروزاں !
درد کی آخری حد پہ بھی یہ دل کو سہارا ہوتا ہے
ہر اک کالی رات کے پیچھے ایک سویرا ہوتا ہے

فنا کی راہیں بقا کے رستوں کی ہم سفر ہیں

ہتھیلیوں پہ جو سج کے نکلے ہیں
کیسے سر ہیں !
ہر ایک آندھی کے راستے میں جو معتبر ہیں
یہ کیا شجر ہیں !

یہ کیسا نشّہ ہے جو لہو میں سرور بن کر اُتر گیا ہے!
تمام آنکھوں کے آنگنوں میں یہ کیسا موسم ٹھہر گیا ہے!
وفا کی راہوں میں جلنے والے چراغ روشن رہیں ہمیشہ
کہ ان کی لَو سے جمالِ جاں کا ہر ایک منظر سنور گیا ہے

گھروں کے آنگن ہیں قتل گاہیں ، تمام وادی ہے ایک مقتل
چنار شعلوں میں گھر گئے ہیں سُلگ رہا ہے تمام جنگل
مگر ارادوں کی استقامت میں کوئی لغزش کہیں نہیں ہے
لہو شہیدوں کا کر رہا ہے جوان جذبوں کو اور صیقل

جو اپنی حُرمت پہ کٹ مرے ہیں
وہ سر جہاں میں عظیم تر ہیں
لہُو سے لکھی گئیں جو سطریں
وُہی امر تھیں ، وُہی امر ہیں

بارش

ایک ہی بارش برس رہی ہے چاروں جانب
بام و در پر ___ شجر حجر پر
گھاس کے اُجلے نرم بدن اور زمین کی چھت پر
شاخ شاخ میں اُگنے والے برگ و ثمر پر ،
لیکن اس کی دِل میں اُترتی گُھم گُھم سی آواز کے اندر
جانے کتنی آوازیں ہیں ___ !!
قطرہ قطرہ دِل میں اُترنے ، پھیلنے والی آوازیں
جن کو ہم محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن

لفظوں میں دوہرا نہیں پاتے
جانتے ہیں ، سمجھا نہیں پاتے
جیسے پت جھڑ کے موسم میں ایک ہی پیڑ پہ اُگنے والے
ہر پتّے پر ایسا ایک سماں ہوتا ہے
جو بس اُس کا ہی ہوتا ہے
جیسے ایک ہی دُھن کے اندر بجنے والے ساز
اور اُن کی آواز ___
کھڑکی کے شیشوں پر پڑتی بوندوں کی آواز کا جادُو
رِم جھم کے آہنگ میں ڈھل کر سرگوشی بن جاتا ہے
اور لہُو کے خلیے اُس کی باتیں سُن لگ جاتے ہیں ،
ماضی ، حال اور مستقبل ، تینوں کے چہرے
گڈ مڈ سے ہو جاتے ہیں
آپس میں کھو جاتے ہیں
چاروں جانب ایک دھنک کا پردہ سا لہراتا ہے
وقت کا پہیّہ چلتے چلتے ، تھوڑی دیر کو تھم جاتا ہے

(۲)

آج بہت دن بعد سُنی ہے بارش کی آواز
آج بہت دن بعد کسی منظر نے رستہ روکا ہے
رِم جِھم کا ملبوس پہن کر یاد کسی کی آئی ہے
آج بہت دن بعد اچانک آنکھ یونہی بھر آئی ہے

(۳)

آنکھ اور منظر کی وسعت میں چاروں جانب بارش ہے
اور بارش میں، دُور کہیں اِک گھر ہے جس کی
ایک ایک اینٹ پہ تیرے میرے خواب لکھے ہیں
اور اُس گھر کو جانے والی کچھ گلیاں ہیں
جن میں ہم دونوں کے سائے تنہا تنہا بھیگ رہے ہیں
دروازے پر قفل پڑا ہے اور دریچے سُونے ہیں
دیواروں پر جمی ہُوئی کائی میں چھُپ کر

موسم ہم کو دیکھ رہے ہیں
کتنے بادل، ہم دونوں کی آنکھ سے اوجھل
برس برس کر گُزر چکے ہیں!

ایک کمی سی،
ایک نمی سی،
چاروں جانب پھیل رہی ہے،
کئی زمانے ایک ہی پَل میں
باہم مِل کر بھیگ رہے ہیں
اندر یادیں سُوکھ رہی ہیں
باہر منظر بھیگ رہے ہیں

○

عمر اِک خواب سجانے میں گئی
تیری تصویر بنانے میں گئی

کٹ گئی کچھ تو غمِ ہجراں میں
اور کچھ ملنے ملانے میں گئی

ایک شعلہ سا کبھی لپکا تھا
زندگی آگ بجھانے میں گئی

ایسے سودے میں تو گھاٹا ہے، اگر
آبرو ، سر کے بچانے میں گئی!

تم بھی چاہو تو نہیں بن سکتی
بات ، جو بات بنانے میں گئی

رہ گئی کچھ تو ترے سُننے میں
اور کچھ اپنے سنانے میں گئی

عُمر بھر کی تھی کمائی میری
جو ترے بام پہ آنے میں گئی

عکس در عکس فقط حیرت تھی
عقل جب آئنہ خانے میں گئی

کوئی تصویر مکمّل نہیں ہونے پائی

اَب جو دیکھیں تو کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی
یہ شب و روز و مہ و سال کا پُر پیچ سفر
قدرے آسان بھی ہو سکتا تھا !
یہ جو ہر موڑ پہ کچُھ اُلجھے ہُوئے رستے ہیں
ان میں ترتیب کا اِمکان بھی ہو سکتا تھا !
ہم ذرا دھیان سے چلتے تو وہ گھر
جس کے بام و در و دیوار پہ ویرانی ہے !
جس کے ہر طاق میں رکھی ہُوئی حیرانی ہے !
جس کی ہر صُبح میں شاموں کی پریشانی ہے !
اِس میں ہم چین سے آباد بھی ہو سکتے تھے،

بخت سے امن کی راہیں بھی نکل سکتی تھیں
وقت سے صُلح کا پیمان بھی ہو سکتا تھا

(۲)

اب جو دیکھیں تو بہت صاف نظر آتے ہیں
سارے منظر بھی، پسِ منظر بھی
لیکن اِس دیر خیالی کا صِلہ کیا ہوگا ؟
یہ تو سب بعد کی باتیں ہیں مری جان، انھیں
دیکھتے، سوچتے رہنے سے بھلا کیا ہوگا ؟
وہ جو ہونا تھا ہُوا ___ ہو بھی چُکا
وقت کی لَوح پہ لکّھی ہُوئی تحریر کے حرف
خطِ تنسیخ سے واقف ہی نہیں
بخت، مکتب کے رجسٹر کی طرح ہوتا ہے
اپنے نمبر پہ جو "لبّیک" نہیں کہہ پاتے
اُن کا کچُھ عُذر نہیں ___ کوئی بھی فریاد نہیں
یہ وہ طائر ہیں جنھیں اپنی نوا یاد نہیں

(۳)

لائنیں کٹتی رہیں لفظ بدلنے کے سبب
کوئی تحریر، مسلسل نہیں ہونے پائی
حاصلِ عمر — یہی چند ادھورے خاکے!
کوئی تصویر، مکمّل نہیں ہونے پائی۔

فرق

کہا اُس نے دیکھو،
"اگر یہ محبّت ہے، جس کے دوشالے
میں لپٹے ہُوئے ہم کئی منزلوں سے گزر آئے ہیں!
دھنک موسموں کے حوالے ہمارے بدن پہ لکھے ہیں!
کئی ذائقے ہیں،
جو ہونٹوں سے چل کر لہُو کی روانی میں گھُل مل گئے ہیں!

تو پھر اُس تعلّق کو کیا نام دیں گے؟
جو جسموں کی تیز اور اندھی صدا پر رگوں میں مچلتا ہے
پوروں میں جلتا ہے

اور ایک آتش فشاں کی طرح
اپنی حدّت میں سب کچھ بہاتا ہُوا ___ سنسناتا ہُوا
راستوں میں فقط کچھ نشاں چھوڑ جاتا ہے
(جن کو کوئی یاد رکھتا نہیں)
تو کیا یہ سبھی کچھ ،
اُنہی چند آتش مزاج اور بے نام لمحوں کا اِک کھیل ہے ؟
جو ازل سے مری اور تری خواہشوں کا
انوکھا سا بندھن ہے ___ ایک ایسا بندھن
کہ جس میں نہ رسّی نہ زنجیر کوئی ،
مگر اِک گرہ ہے ،
فقط اِک گرہ ہے کہ لگتی ہے اور پھر
گرہ در گرہ یہ لہو کے خلیّوں کو یُوں باندھتی ہے
کہ ارض و سما میں کشش کے تعلّق کے جتنے مظاہر
نہاں اور عیاں ہیں ،
غلاموں کی صُورت قطاروں میں آتے ہیں

نظریں جُھکائے ہوئے بیٹھ جاتے ہیں
اور اپنے رستوں پہ جاتے نہیں
بات کرتے نہیں ،
سر اُٹھاتے نہیں۔"

کہا میں نے ، جاناں !
"یہ سب کچُھ بجا ہے
ہمارے تعلق کے ہر راستے میں
بدن سنگِ منزل کی صُورت کھڑا ہے !
ہوس اور محبّت کا لہجہ ہے یکساں
کہ دونوں طرف سے بدن بولتا ہے۔!
بظاہر زمان و مکاں کے سفر میں
بدن ابتدا ہے ، بدن انتہا ہے
مگر اس کے ہوتے ___ سبھی کچُھ کے ہوتے
کہیں بیچ میں وہ جو اِک فاصلہ ہے !
وہ کیا ہے !

مری جان ، دیکھو
یہ موہوم سا فاصلہ ہی حقیقت ہیں
ساری کہانی کا اصلی سِرا ہے
(بدن تو فقط لوح کا حاشیہ ہے)
بدن کی حقیقت، محبّت کے قصّے کا صرف ایک حصّہ ہے
اور اُس سے آگے
محبّت میں جو کچھ ہے اُس کو سمجھنا
بدن کے تصوّر سے ہی ماورا ہے
یہ اِک کیفیت ہے
جسے نام دینا تو ممکن نہیں ہے، سمجھنے کی خاطر بس اِتنا سمجھ لو
زمیں زادگاں کے مقدّر کا جب فیصلہ ہو گیا تھا
تو اپنے تحفّظ، تشخّص کی خاطر
ہر اک ذات کو ایک تالہ مِلا تھا۔
وہ مخصوص تالہ، جو اک خاص نمبر پہ کھُلتا ہے لیکن
کسی اور نمبر سے مِلتا نہیں۔

تجھے اور مجھے بھی یہ تالے مِلے تھے
مگر فرق اِتنا ہے دونوں کے کھُلنے کے نمبر وہی ہیں
اور ان نمبروں پہ ہمارے سوا
تیسرا کوئی بھی قفل کھُلتا نہیں۔
تری اور مری بات کے درمیاں
بس یہی فرق ہے!
ہوس اور محبّت میں اے جانِ جاں
بس یہی فرق ہے!!

مگر اک ستارۂ مہرباں

کئی چاند دُھند میں کھو گئے
کئی جاگ جاگ کے سو گئے
مگر اک ستارۂ مہرباں
جو گواہ تھا

سرِ شام سے دمِ صُبح تک

کسی وصل رنگ سی رات کا
کسی بے کنار سے لُطف کا
کسی مُشکبار سی بات کا

مرے ساتھ تھا ،
مرے ساتھ ہے ۔!!

ناممکن

آنکھوں کو کیسے مل سکے خوابوں پہ اختیار!
قوسِ قزح کے رنگ کہیں ٹھہرتے نہیں ،
منظر بدلتے جاتے ہیں نظروں کے ساتھ ساتھ
جیسے کہ اِک دشت میں لاکھوں سراب ہوں
جیسے کہ اِک خیال کی شکلیں ہوں بے شمار

ہونی ۔ انہونی

بادل ہوں یا کہ دریا ، دونوں نہیں رُکیں گے
صحرا کی ریت یونہی بازو کُشا رہے گی !
موسم ہو یا کہ لمحہ ، دونوں نہیں رُکیں گے
بے چین منظروں میں بے کُل دُعا رہے گی !
سپنا ہو یا کہ سایا ، دونوں نہیں رُکیں گے
رستوں میں ہاتھ ملتی پاگل ہَوا رہے گی !

آنکھیں مری ہوں یا ہو چہرا ترا اے جاناں
اس گردِ بادِ غم میں دونوں ہی خاک ہوں گے
دونوں نہیں رہیں گے
لیکن یہ خاک اپنی اِس خاکداں سے اُٹھ کر
تاروں میں جا رہے گی
جو درد کے مسافر ، آئیں گے بعد اپنے
اُن کے لیے وفا کا یہ راستہ رہے گی ۔

عُمر بھر کی کمائی

وہ جو ایک خواب سی رات تھی

مرے بخت میں

یُونہی ایک پَل میں گزُر گئی

وہ گزُر گئی تو پتہ چلا

وہی ایک کام کی چیز تھی

مِری زندگانی کے رَخت میں

سیلف میڈ لوگوں کا المیہ

روشنی مزاجوں کا کیا عجب مقدّر ہے

زندگی کے رستے میں، بچھنے والے کانٹوں کو

راہ سے ہٹانے میں،

ایک ایک تنکے سے آشیاں بنانے میں

خُوشبوئیں پکڑنے میں، گُلستاں سجانے میں

عُمر کاٹ دیتے ہیں۔

عمر کاٹ دیتے ہیں

اور اپنے حصّے کے پھُول بانٹ دیتے ہیں

کیسی کیسی خواہش کو قتل کرتے جاتے ہیں

درگزر کے گلشن میں اَبر بن کے رہتے ہیں

صَبر کے سمندر میں کشتیاں چلاتے ہیں

یہ نہیں کہ اِن کو اِس روز و شب کی کاہش کا
کچھ صِلہ نہیں مِلتا !
مرنے والی آسوں کا خُوں بہا نہیں مِلتا !

زندگی کے دامن میں جس قدر بھی خوشیاں ہیں
سب ہی ہاتھ آتی ہیں،
سب ہی مِل بھی جاتی ہیں
وقت پر نہیں ملتیں — وقت پر نہیں آتیں!
یعنی ان کو محنت کا اُجر مِل تو جاتا ہے
لیکن اِس طرح جیسے،
قرض کی رقم کوئی قسط قسط ہو جائے
اصل جو عبارت ہو "پس نوشت" ہو جائے

فصلِ گُل کے آخر میں پھول ان کے کھلتے ہیں
اِن کے صحن میں سورج دیر سے نکلتے ہیں۔

شاعر

کیسے کاریگر ہیں یہ !
آس کے درختوں سے
لفظ کاٹتے ہیں اور سیڑھیاں بناتے ہیں !

کیسے باہُنر ہیں یہ !
غم کے بیج بوتے ہیں
اور دِلوں میں خوشیوں کی کھیتیاں اُگاتے ہیں

کیسے چارہ گر ہیں یہ
وقت کے سمندر میں
کشتیاں بناتے ہیں، آپ ڈوب جاتے ہیں۔

یا سمیع و یا بصیر

* ہجومِ غم سے جس دم آدمی گھبرا سا جاتا ہے
تو ایسے میں
اُسے آواز پہ قابو نہیں رہتا
وہ اِتنے زور سے فریاد کرتا، چیختا اور بلبلاتا ہے
کہ جیسے وہ زمیں پر اور خُدا ہو آسمانوں میں

مگر ایسا بھی ہوتا ہے
کہ اُس کی چیخ کی آواز کے رُکنے سے پہلے ہی
خُدا کچھ اِس قدر نزدیک سے اور اس قدر
رحمت بھری مسکان سے اس کو تھپکتا اور اس کی بات سُنتا ہے
کہ فریادی کو اپنی چیخ کی شدّت،
صدا کی بے یقینی پر ندامت ہونے لگتی ہے

○

کسی کی دُھن میں، کسی کے گماں میں رہتے ہیں
ہم ایک خواب کی صُورت جہاں میں رہتے ہیں

ہمارے اشک چمکتے ہیں اُس کی آنکھوں میں
زمیں کا رزق ہیں اور آسماں میں رہتے ہیں

جو لوگ کرتے ہیں دُنیا سے سُود کی خواہش
ہمیشہ گردشِ دورِ زیاں میں رہتے ہیں

نظر کے سامنے، آبِ رواں کے ہوتے ہُوئے
جو اہلِ صبر ہیں، تشنہ لباں میں رہتے ہیں

ہر اک بھنور سے زیادہ تباہ کار ہیں یہ
جو چند خوف پھٹے بادباں میں رہتے ہیں

اُنھی کے دم سے ہے جاری یہ روشنی کا سفر
جو دل چراغ کی صُورت جہاں میں رہتے ہیں

یہ اہلِ درد ہیں ان کا چلن ہے سب سے الگ
مکان رکھتے ہیں اور لامکاں میں رہتے ہیں

یہ جان کر بھی کہ انتم ہے بھُربھری مٹی
یہ لوگ خواہشِ نام و نشاں میں رہتے ہیں!

کسی سراب کی صُورت، کسی گُماں کی طرح
ہم اپنے ہست کی ریگِ رواں میں رہتے ہیں

سَمے کا چاک ہے اور خاک ہے حوادث کی
زمین زاد، سدا امتحاں میں رہتے ہیں

یہ معجزہ جو نہیں ہے تو اور کیا ہے، حباں!
کہ آگ ہیں اور خاکداں میں رہتے ہیں

ہمارے بختِ ستم ساز کا کمال ہے یہ
گُلِ بہار ہیں لیکن خزاں میں رہتے ہیں

حصارِ دشت میں متروک راستوں کی طرح
ہمارے گیت، ترے گُلستاں میں رہتے ہیں

مکاں کی قید سے، حدِّ زماں سے باہر
ہم اپنے ذہن کی موجِ رواں میں رہتے ہیں

غموں کی دُھوپ سے ڈرتے نہیں ہیں وہ امجد
کسی نگاہ کے جو سائباں میں رہتے ہیں

ہَوا ہے آتشیں مزاج

ہَوا ہے آتشیں مزاج
بدل رہے ہیں سب رواج
بھٹک رہی ہے ، روشنی
ہُوا ہے ظُلمتوں کا راج
ہر ایک سانس قرض ہے
تمام زندگی ہے باج
وہ جس کا منتظر تھا ''کل''
اُسی کا مُنتظر ہے ''آج''
نشّے میں گُم ہیں تخت و تاج
ہَوا ہے آتشیں مزاج

وفا کا خوُں ہے ہر طرف
کسی جبیں پہ بَل نہیں
طَرح طرح کے تجزیئے
مگر کوئی عمل نہیں
سوال ہی سوال ہیں
کسی کے پاس حل نہیں
بکھر گئے ہیں پھُول سَب
کسی شجر پہ پھل نہیں
نہ شرم ہے کوئی نہ لاج
ہَوا ہے آتشیں مزاج

جو پُل تھی سب کے بیچ میں
وہ رسم و راہ کھو گئی
سروں سے چھت سَرک گئی
ہر اک پناہ کھو گئی

ہے لفظ لفظ روشنی
صداقتوں کے درمیاں

(ق)

جو زندگی فروش تھے
وہی ہیں شہر کی زباں

جو خُود زمیں کا بوجھ ہیں
بنے ہیں میرِ کارواں

جو روشنی کے چور تھے
وہی ہیں روشنی نشاں

(ق)

غلام سر اُٹھائیں گے
کہاں تھا تخت کو گُماں!

وفا کا خُوں ہے ہر طرف
کسی جبیں پہ بَل نہیں
طرح طرح کے تجزیئے
مگر کوئی عمل نہیں
سوال ہی سوال ہیں
کسی کے پاس حل نہیں
بکھر گئے ہیں پھُول سب
کسی شجر پہ پھَل نہیں
نہ شرم ہے کوئی نہ لاج
ہَوا ہے آتشیں مزاج

جو پُل تھی سب کے بیچ میں
وہ رسم و راہ کھو گئی
سروں سے چھت سرک گئی
ہر اِک پناہ کھو گئی

ہے لفظ روشنی
صداقتوں کے درمیاں

(ق)

جو زندگی فروش تھے
وہی ہیں شہر کی زباں

جو خُود زمیں کا بوجھ ہیں
بنے ہیں میرِ کارواں

جو روشنی کے چوَر تھے
وہی ہیں روشنی نشاں

(ق)

غلام سر اُٹھائیں گے
کہاں تھا تخت کو گُماں!

زمین کھا گئی اُنھیں
جو بَن رہے تھے آسماں

جو زندگی کا حُسن تھے
وہ لوگ رہ گئے کہاں

بہت تلاش ہو چکی
بس اب تو تھک گئے میاں

کہاں ہیں میرے ہم نفس
کہاں ہیں میرے ہم زباں!

یوں تو کیا چیز زندگی میں نہیں
جیسے سوچی تھی اپنے جی میں، نہیں

دِل ہمارا ہے چاند کا وہ رُخ
جو ترے رُخ کی روشنی میں نہیں

سب زمانوں کا حال ہے اِس میں
اِک وہی شام! جنتری میں نہیں

ہیں خلاؤں میں کتنی دُنیائیں
جو کسی حدِّ آگہی میں نہیں!

ہو کلیسا، حَرم کہ بُت خانہ
فرق ان میں ہے، بندگی میں نہیں

ایک اِنساں ہے؛ زندگی جیسا
اور وہ میری زندگی میں نہیں!

تُو نہیں، تیرا غم ہے چاروں طرف
جس طرح چاند، چاندنی میں نہیں

اَجر تو صَبر کے صِلے میں ہے
موجِ دریا میں، تشنگی میں نہیں

ایک بے نام سے خلا کے سوا
کون سا رنگ، کافری میں نہیں!

مرنے والے مرجاتے ہیں
جیون کے اسٹیج پر اُن کا رول مکمّل ہو جاتا ہے
لیکن اُن کی ایگزٹ پر یہ منظر ختم نہیں ہوتا
اِک اور ڈرامہ چلتا ہے
اخباروں کے لوگ بھڑکتی لیڈیں گھڑنے لگ جاتے ہیں
جن کے دَم سے اُن کی روزی چلتی ہے اور
ٹی وی ٹیمیں کیمرے لے کر آ جاتی ہیں
تاکہ وژیول سج جائے اور
اعلیٰ افسر
اپنی اپنی سیٹ سے اُٹھ کر رش کرتے ہیں
ایسا ناں ہو حاکمِ اعلیٰ
یا کوئی اُس سے مِلتا جُلتا
اُن سے پہلے آ پہنچے
پھر سب مِل کر اس ”ہونی“ کے پس منظر پہ
اپنے اپنے شک کی وضاحت کرتے ہیں اور

حاکمِ اعلیٰ یا کوئی اس سے مِلتا جُلتا
دہشت گردی کی بھرپُور مذمّت کر کے
مرنے والوں کی بیوائوں اور بچّوں کو
سرکاری امداد کا مژدہ دیتا ہے
اور چلتے چلتے ہاسپٹل میں
زخمی ہونے والوں سے کچھ باتیں کر کے جاتا ہے
حزبِ مخالف کے لیڈر بھی
اپنے فرمودات کے اندر
کُرسی والوں کی ناکامی، نااہلی اور کم کوشی کا
خُوب ہی چرچا کرتے ہیں
گرجا برسا کرتے ہیں
اگلے دِن اور آنے والے چند دِنوں تک یہ سب باتیں
خُوب اُچھالی جاتی ہیں، پھر دھیرے دھیرے
اِن کے بدن پہ گَرد سی جمنے لگتی ہے

باہر کبھی تو جھانک کے کھڑکی سے دیکھتے،
کس کو پُکارتا ہُوا یہ کُو بہ کُو ہے کون!

آنکھوں میں رات آ گئی لیکن نہیں کھُلا
میں کس کا مدّعا ہُوں؟ مِری جستجو ہے کون!

کس کی نگاہِ لُطف نے موسم بدل دیئے
فصلِ خزاں کی راہ میں یہ مُشکبو ہے کون!

بادل کی اوٹ سے کبھی تاروں کی آڑ سے
چُھپ چُھپ کے دیکھتا ہُوا یہ حیلہ جُو ہے کون!

تارے ہیں آسماں میں جیسے زمیں پہ لوگ
ہر چند ایک سے ہیں مگر ہُو بہو ہے کون!

ہونا تو چاہیئے کہ یہ میرا ہی عکس ہو!
لیکن یہ آئینے میں مرے رُو برُو ہے کون!

اِس بے کنار پھیلی ہُوئی کائنات میں
کس کو خبر کہ کون ہوں مَیں! اور تُو ہے کون!

سارا فساد بڑھتی ہُوئی خواہشوں کا ہے
دِل سے بڑا جہان میں امجدؔ عدُو ہے کون!

کالا جادُو

میرا تمام فن ، مری کاوِش ، مرا ریاض
اِک نا تمام گیت کے مصرعے ہیں جن کے بیچ
معنی کا ربط ہے نہ کسی قافیے کا میل
انجام جس کا طے نہ ہُوا ہو، اِک ایسا کھیل!

مری متاع ، بس یہی جادُو ہے عشق کا
سیکھا ہے جس کو مَیں نے بڑی مشکلوں کے ساتھ
لیکن یہ سحرِ عشق کا تحفہ عجیب ہے
کھلتا نہیں ہے کچھ کہ حقیقت میں کیا ہے یہ!
تقدیر کی عطا ہے یا کوئی سزا ہے یہ!
کس سے کہیں اے جاں کہ یہ قصّہ عجیب ہے

کہنے کو یوں تو عشق کا جادُو ہے میرے پاس
پر میرے دِل کے واسطے اِتنا ہے اِس کا بوجھ
سینے سے اِک پہاڑ سا، ہٹتا نہیں ہے یہ
لیکن اَثر کے باب میں ہلکا ہے اِس قدر
تجھ پر اگر چلاؤں تو چلتا نہیں ہے یہ

○

گردِ سفر میں بھول کے منزل کی راہ تک
پھر آ گئے ہیں لوگ نئی قتل گاہ تک

اِک بے کسی کا جال ہے پھیلا چہار سُو
اِک بے بسی کی دُھند ہے دِل سے نگاہ تک

بالائے سطحِ آب تھے جتنے تھے بے خبر
اُبھرے نہیں ہیں وہ کہ جو پہنچے ہیں تھاہ تک

اِک دُوسرے پہ جان کا دینا تھا جس میں کھیل
اب رہ گیا ہے صرف وہ رشتہ نباہ تک

اہلِ نظر ہی جانتے ہیں کیسے اُفق مثال!
حدِ ثواب جاتی ہے حدِّ گناہ تک

زنجیرِ عدل اب نہیں کھینچے گا کوئی ہاتھ
رُلتے ہیں اب تو پاؤں میں تاج و کُلاہ تک

پھُولوں سے اِک بھری ہُوئی بستی یہاں پہ تھی
اب دل پہ اس کا ہوتا نہیں اشتباہ تک

آتی ہے جب بہار تو آتی ہے ایک ساتھ
باغوں سے لے کے دشت میں اُگتی گیاہ تک

جانا ہے ہم کو خواب کی کشتی میں بیٹھ کر
کاجل سے اِک بھری ہُوئی چشمِ سیاہ تک

جذبات بُجھ گئے ہوں تو کیسے جلے یہ دِل
میرِ سپہ کا نام ہے اُس کی سپاہ تک

امجدؔ اب اس زمین پہ آنے کو ہے وہ دِن
عالم کے ہاتھ پہنچیں گے عالم پناہ تک

○

دل کے کہنے پہ جب لڑے تم تھے
پھر زمانے سے کیوں ڈرے تم تھے

نقش تھے ہاتھ کی لکیروں میں
دسترس سے مگر پرے تم تھے

لاکھ پھیلا، سمٹ نہ پائے تم
دل کی اوقات سے بڑے تم تھے

ہم نے جس رہ کا انتخاب کیا
اُس کے ہر موڑ پر کھڑے تم تھے

اِک شرارِ گماں کی مانند !
دھیان کی راکھ میں پڑے تم تھے

(ق)

جانے کس لہر میں تھا میں سرشار!
جانے کس موج میں ہرے تم تھے!

ہاتھ کے لمس سے چھلک اُٹھے
جامِ مے کی طرح بھرے تم تھے

کیا تھا! جس میں اُلجھ گیا تھا میں
جانے کس بات پر اَڑے تم تھے؟

ایک ہی لمحۂ خموشی میں
حدِّ آواز سے پرے تم تھے

بادل — میں اور تم

بادل کے اور بحر کے رشتے عجیب ہیں !
کالی گھٹا کے دوش پہ برفوں کا رخت ہے
جتنے زمیں پہ بہتے ہیں دریا، سبھی کا رُخ
اِک بحرِ بے کنار کی منزل کی سَمت ہے

خوابوں میں ایک بھیگی ہُوئی خُوش دِلی کے ساتھ
ملتی ہے آشنا سے کوئی اجنبی سی موج
بادل بھنور کے ہاتھ سے لیتے ہیں اپنا رزق
پھر اس کو بانٹتے ہیں عجب بے رُخی کے ساتھ!
جنگل میں، صحنِ باغ میں، شہروں میں، دشت میں
چشموں میں، آبشار میں، جھیلوں کے طشت میں

گاہے یہ اوس بن کے سنورتے ہیں برگ برگ
گاہے کسی کی آنکھ میں بھرتے ہیں اِس طرح
آنسو کی ایک بُوند میں دجلہ دِکھائی دے
اور دُوسرے ہی پل میں جو دیکھو تو دُور تک
ریگِ روانِ دَرد کا صحرا دِکھائی دے!

بادل کے اور بحر کے جتنے ہیں سلسلے
مُجھ سے بھی تیری آنکھ کے رِشتے، وہی تو ہیں!!

○

یہ بولتے ہوئے لمحے یہ ڈُولتی ہُوئی شام
ترے جمال کے صدقے، ترے وصال کے نام

خُدا کرے سَدا کھلتے رہیں — چلیں یوں ہی
ترے لبوں کے ستارے تری نظر کے جام

ترے بَدن کی پہیلی میں رُک گئی خُوشبُو
ترے لباس پہ آکر ہُوئے ہیں رنگ تمام

طلسمِ بندِ قبا سے ہیں اُنگلیاں روشن
لہُو میں آگ کی صُورت اُتر رہی ہے شام

مہک وفا کی سدا ساتھ ساتھ چلتی رہے
محبتوں کے سفر کا بخیر ہو انجام

متاعِ دزد تو ورثہ ہے آنکھ والوں کا
تجھے یہ زخم مبارک ہو اے دلِ ناکام!

بھٹک رہے ہیں کسی خواب کی طرح کب سے
اِس آس پہ کہ تری آنکھ میں کریں آرام

میں اُس گلی سے گزرتا ہوں بار بار امجد
کبھی تو بام پہ آئے گا میرا ماہِ تمام

○

کلام کرتی نہیں بولتی بھی جاتی ہے
تری نظر کو یہ کیسی زبان آتی ہے!

کبھی کبھی مجھے پہچانتی نہیں وہ آنکھ
کبھی چراغ سے چاروں طرف جلاتی ہے

عجب تضاد میں پلتی ہے تیرے وصل کی آس
کہ ایک آگ بجھاتی ہے اِک لگاتی ہے

وہ دیکھتی ہے مجھے ایسی مست نظروں سے
مرے لہو میں کوئی آگ سرسراتی ہے

یہ چار سُو کا اندھیرا سمٹنے لگتا ہے
کچھ اِس طرح تری آواز جگمگاتی ہے

یہ کوئی اور نہیں آگ ہے یہ اندر کی
بدن کی رات میں جو روشنی بچھاتی ہے

میں اس کو دیکھتا رہتا ہُوں رات ڈھلنے تک
جو چاندنی تری گلیوں سے ہو کے آتی ہے

یہ روشنی بھی عطا ہے تری محبّت کی
جو میری رُوح کے منظر مُجھے دکھاتی ہے

اُمیدِ وصل بھی امجدؔ ہے کانچ کی چُوڑی
کہ پہننے میں کئی بار ٹوٹ جاتی ہے

خُدا اور خلقِ خُدا

یہ خلقِ خُدا جو بکھرے ہُوئے
بے نام و نشاں پتّوں کی طرح
بے چین ہَوا کے رَستے میں گھبرائی ہُوئی سی پھرتی ہے
آنکھوں میں شکستہ خواب لیے
سینے میں دلِ بیتاب لیے
ہونٹوں میں کراہیں ضبط کیے
ماتھے کے دریدہ صفحے پر
اِک مہرِ ندامت ثبت کیے ٹھکرائی ہُوئی سی پھرتی ہے
اے اہلِ حشم اے اہلِ جفا
یہ طبل و علَم یہ تاج و کُلاہ و تختِ شہی
اس وقت تمھارے ساتھ سہی

تاریخ مگر یہ کہتی ہے
اِسی خلقِ خدا کے ملبے سے اِک گُونج کہیں سے اُٹھتی ہے
یہ دھرتی کروٹ لیتی ہے اور منظر بدلے جاتے ہیں
یہ طبل و علَم، یہ تختِ شہی، سب خلقِ خدا کے ملبے کا
اِک حصّہ بنتے جاتے ہیں

ہر راج محل کے پہلو میں اِک رستہ ایسا ہوتا ہے
مقتل کی طرف جو کُھلتا ہے اور بِن بتلائے آتا ہے
تختوں کو خالی کرتا ہے اور قبریں بھرتا جاتا ہے

○

لبوں پہ رُکتی، دِلوں میں سما نہیں سکتی
وہ ایک بات جو لفظوں میں آ نہیں سکتی

جو دِل میں ہو نہ زرِ غم تو اشک پانی ہے
کہ آگ خاک کو کُندن بنا نہیں سکتی

یقیں گمان سے باہر تو ہو نہیں سکتا
نظر خیال سے آگے تو جا نہیں سکتی

دِلوں کی رمز فقط اہلِ درد جانتے ہیں
تری سمجھ میں مری بات آ نہیں سکتی

یہ سوزِ عشق تو گونگے کا خواب ہے جیسے
مری زباں، مری حالت بتا نہیں سکتی

(ق)

سمٹ رہی ہے مرے بازوؤں کے حلقے میں
حیا کے بوجھ سے پلکیں اُٹھا نہیں سکتی

جو کہہ رہا ہے سُلگتا ہُوا بدن اُس کا
بتا بھی پاتی نہیں اور چھُپا نہیں سکتی

اِک ایسی ہجر کی آتش ہے میرے دل میں جسے
کسی وصال کی بارش بُجھا نہیں سکتی

تو جو بھی ہونا ہے امجد یہیں پہ ہونا ہے
زمیں مدار سے باہر تو جا نہیں سکتی!

اکیسویں صدی کے لیے ایک نظم

سَمے کے رستے میں بیٹھنے سے
تو صرف چہروں پہ گرد جمتی ہے
اور آنکھوں میں خواب مرتے ہیں
جن کی لاشیں اُٹھانے والا کوئی نہیں ہے !

ہماری قسمت کے زائچوں کو بنانے والا کوئی ہو شاید
پر ان کا مطلب بتانے والا کوئی نہیں ہے !
وہ سارے رستے روایتوں کے کہ جن کی گرہیں کسی ہُوئی ہیں
ہمارے ہاتھوں سے اور پاؤں سے لے کے خوابوں کی گردنوں تک !
ہماری رُوحوں میں کھُبتے جاتے ہیں
اور ہم کو بچانے والا، چھڑانے والا کوئی نہیں ہے !

زباں پہ زنجیر سی پڑی ہے
دِلوں میں پھندے ہیں
اور آنکھوں میں شامِ زنداں کی بے کسی ہے
چراغ سارے بجھے پڑے ہیں جلانے والا کوئی نہیں ہے!

مرے عزیزو، مجھے یہ غم ہے
جو ہو چکا ہے بہت ہی کم ہے
سمے کے رَستے میں بیٹھے رہنے کے دن بھی اَب ختم ہو رہے ہیں
بچے کھچے یہ جو بال و پَر ہیں
جو راکھ داں میں سُلگنے والے یہ کچھ شرر ہیں
ہمارے بچّوں کے سر چھپانے کو جو یہ گھر ہیں
اب ان کی باری بھی آرہی ہے
وہ ایک مہلت جو آخری تھی
وہ جا رہی ہے ——

تو اس سے پہلے زمین کھائے
ہمارے جسموں کو اور خوابوں کو
اور چہروں پہ اپنے دامن کی اوٹ کر دے
یہ سرد مٹی جو بُھربُھری ہے
ہماری آنکھوں کے زرد حلقے لہُو سے بھر دے!

مرے عزیزو چلو کہ آنکھوں کو مَل کے دیکھیں
کہاں سے سُورج نکل رہے ہیں!
سمے کے رستے پہ چل کے دیکھیں!

نعت

اَزلوں پہلاں، اَبدوں پچھے، روشن جس دا ناں
میں قطرہ، اُس بحر دی امجد کیویں صفت کراں!

اپنے حق لئی اُٹھن والے سب ہتھاں دا زور
سارے جگ دے مظلوماں تے کمزوراں دی باں

دُنیا دی اِس راہواں کھُنجی، گھُمن گھیری نوں
اوہدے ناں دے تارے باہجوں کیویں پار کراں!

دُکھاں دی اس دُھپ اچ آقا، پنڈے لُوس گئے
رحمت دے بدّل دی کر دے ساڈے سِر تے چھاں

جہدے پاک بدن دی مٹی اِس دھرتی دا مان
آدم زاد دی پگ دا شملہ، اوہدا اُچا ناں

جیہڑی اوہنے اپنے سوہنے قدماں نال بنائی
اوسے راہ وِچ جیواں امجدؔ، اوسے وِچ مَراں

سلام

پُھلاں ورگے بچیاں دے سنگھ کنڈیاں وانگر سُکے سَن
ریتاں دے وچ شُوک رہئی سی کالی ناگن پیاس
اُتے اگ ورساندا سُورج، تھلّے بلدی ریت
واواں دے وچ چھپیا دا سی کوئی انوکھا بھیت
چار چوفیرے کنیاں وانگر زہری تیر پئے وسدے سَن
نہر فرات دا کنڈا مَل کے ویری دُشمن ہَسدے سَن
سارے سجن بیلیاں دے سَن خُونوں خُون لباس
ریتاں دے وچ شُوک رہئی سی کالی ناگن پیاس

پِچھے ہٹنا آندا نئیں سی سامنے آن کھلوتا سی
ہر نیزے دی نوک دے اَگے سینہ تان کھلوتا سی
جَد تک نیلے امبر تھلّے آدم زادے وَسّن گے
جان دی بازی لاون ویلے نام حسینؓ دا دَسّن گے

اِک شہر دِی کہانی

کیڑیاں وانگر چار چوفیرے لوکی جیوندے مَردے نیں
قاتلاں ورگیاں شکلاں والے اپنے آپ توں ڈردے نیں
اَدھی راتیں سُورج نکلے سِکر دوپہرے چمکے چَن
اکھاں کڈھ کڈھ اوگر دے نیں جیہڑے سجن پیارے سَن
چُپ چپیتیاں سَڑکاں اُتے کھمبے ہَو کے بھردے نیں
کِسے اجیہے وہم توں ڈر کے رستے باہواں پھڑدے نیں
شہر تے قبرستان اچ یارو اِکّو فرق ہُن رہ گیا اے
اوتھے لوکی چُپ رہندے نیں ایتھے گلاں کردے نیں!!

اپنے آپ نال گلّاں

ساواں اِک دِن مُک جانا اے
اکھاں اِک دِن سُک جانا اے
سِدّے تیر جواناں نے وی
وانگ کماناں جُھک جانا اے
کنّاں لِشکن، کنّاں چمکن
تارے تے ڈُب جاون گے
رنگاں تے خُوشبُوواں والے
پُھل اِک دِن مُرجھاون گے
نویں ذِناں دیاں سچیاں گلاں
کدتک ٹالی جاویں گا!
جھلیا کدتک قبراں اُتے
دیوے بالی جاویں گا!

○

گَل سجناں دی اِنج اساڈے بُلّاں تے ٹُٹ جائے
نویں جوانی جیویں اپنے پنڈے توں شرمائے

دوزخ دل دا دِیوا اتے نئیں بجھے پُھوکاں نال
اتھرو ہون تے ڈک وی لیئے ہڑنوں کون سُکھائے

نال دُعاواں کَد کِھلدے نیں پچھلے سال دے پُھل
ویلے نال پئی کیہوں کھینی اے میرئیے جھلئیے مائے

میں کہنا واں کتھے نیں تے ننوُکے تیزا ہوا
شہر دے سارے لوکی آکھن نویں زمانے آئے

امجد کد تک مُنہ تے غم دی بُکل مار کے سوئیں
چل او سُورج لبھیے جیہڑا سُتے لوگ جگائے

○

جیہڑی میرے ساہواں اندر وانگ مشالاں جگدی اے
اوہدیاں ڈونگیاں اکھاں وچ وی سُرخی اوسے اگ دی اے

تھل اکھاں دا اج وی چارے پاسے کھیہہ اُڈاندا اے
نیں سدھراں دی اج وی اپنے کنڈیوں بارہی وگدی اے

ہتھ ملا کے وچھڑ جائیے، فیدہ کیہہ بدنامی دا
آپس دی گل آپس اچ ای مُکدی چنگی لگدی اے

اوہدے لئی تے انج سی جیویں سُتے تے فیر جاگ پئے!
رات ہجر دی میرے گھر توں سہک سہک کے لنگھدی اے

سوچاں دی چھنکار نیں امجد کیتے کن بے کار مرے
اپنی واج وی ہُون تے مینوں ہور کسے دی لگدی اے

بولیاں

چار چوفیرے تھلّاں دے وِچ سسّی دے لشکارے
پُنّوں ٹاراں مارے

شہر دے دِل چوں اَدھی راتیں اُٹھدی اے اِک چیخ
گونگی اے تاریخ

نہ تُوں بولیں نہ میں بولاں، بولے گا فیر کیہڑا
تیچھے سُنجا ویہڑا!

چھلتر چھلتر ہو کے بھُر گئے رُکھاں ورگے بندے
تیز سمے دے رندے

اساں ای کدھرے سُٹ پائی اے ڈرذاں والی سانجھ
مٹی تے نئیں بانجھ

گلیاں

[D.J. ENRIGHT کی نظم STREETS کا آزاد ترجمہ]

نظم لکھی گئی تو ہنوئی کی گلیوں سے موسوم تھی
اِس میں گرتے بموں سے نکلتی ہُوئی موت کا تذکرہ تھا،
فلاکت، دُکھوں اور بربادیوں کی اذیّت بھری داستاں درج تھی
اِس کے آہنگ میں موت کا رنگ تھا اور دُھن میں تباہی،
ہلاکت، دُکھوں اور بربادیوں کی الم گُونج تھی

نظم کی اِک بڑے ہال میں پیش کش کی گئی
اِک گُلوکار نے اس کو آواز دی
اور سازینے والوں نے موسیقیت سے بھری دُھن بنا کر سجایا اِسے

سازو آواز کی اس حسین پیشکش کو سبھی مجلسوں میں سراہا گیا
جب یہ سب ہو چکا تو کچھ ایسے لگا جیسے عنوان میں
نظم کا نام[1] بھولے سے لکھا گیا ہو حقیقت میں یہ نام سائیگان[2] تھا!
(اور ہر چیز جس رنگ میں پیش آئے وہی اصل ہے)
سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں شاعری اور نغمہ گری کی زباں ایک ہے
جیسے گرتے بموں سے نکلتی ہوئی موت کی داستاں ایک ہے
اور جیسے تباہی، فلاکت دکھوں اور بربادیوں کا نشاں ایک ہے
سچ تو یہ ہے کہ اب کرۂ ارض پر دوسرے شعر گو کی ضرورت نہیں
ہر جگہ شاعری کا سماں ایک ہے
اُس کے الفاظ کی بے نوا آستینوں پہ حسبِ ضرورت ستارے بنانا
مقامی حوالوں کے موتی سجانا
تو ایڈیٹروں کے قلم کی صفائی کا انداز ہے
یا وزیرِ ثقافت کے دفتر میں بیٹھے کلرکوں کے ہاتھوں کا اعجاز ہے!!

[1] شمالی ویت نام کا شہر
[2] جنوبی ویت نام کا شہر

ہیلن

(مارلو کے اشعار کا آزاد ترجمہ)

"یہی وہ چہرہ تھا
جس کی خاطر ہزارہا بادباں کھُلے تھے
اسی کی خاطر
منارِ ایلم کے راکھ بن کر بھسم ہوئے تھے
اے میری جانِ بہار ہیلن!
طلسمِ بوسہ سے میری ہستی امر بنا دے
(یہ اس کے ہونٹوں کے لمسِ شیریں میں کیا کشش ہے کہ
روح تحلیل ہو رہی ہے)
اِک اور بوسہ

کہ میری رُوح پریدہ میرے بدن میں پلٹے
یہ آرزو ہے کہ ان لبوں کے بہشت سائے میں عُمر کاٹوں
کہ ساری دُنیا کے نقشِ باطل
بس ایک نقشِ ثبات ہیلن
سوائے ہیلن کے سب فنا ہے
کہ ہے دلیلِ حیات ہیلن !

اے میری ہیلن !
تری طلب میں ہر ایک ذلّت مُجھے گوارا
میں اپنا گھر بار ، اپنا نام و نمود تجھ پہ نثار کر دُوں
جو حُکم دے وہ سوانگ بھر لُوں
ہر ایک دیوار ڈھا کے تیرا وصال جیتوں
کہ ساری دُنیا کے رنج و غم کے بدل پہ بھاری ہے
تیرے ہونٹوں کا ایک بوسہ
سُبک مثالِ ہوائے شامِ وصال ہیلن !

ستارے پوشاک ہیں تری
اور تیرا چہرہ تمام سیّارگاں کے چہروں سے بڑھ کے روشن
شعاعِ حسنِ اَزل سے خُوشتر ہیں تیرے جلوے
تُمھیں ہو میری وفا کی منزل ـــــ !
تُمھیں ہو کشتی ، تمھیں ہو ساحل "

آدم کُش حربوں کے ردّ میں
مضمونوں کی شکل میں لِکھ کر، ٹکٹ لگا کر، اخباروں کو بھیجتے ہیں
ظالم کی پُر زور مذمّت کرتے ہیں
بارش کے وہ کم طاقت اور بے قیمت سے قطرے ہیں
جو دریاؤں سے اُٹھتے ہیں اور اُٹھتے ہی گِر جاتے ہیں

نامردی کچھ یوں ہے جیسے کوئی ربڑ کی دیواروں میں چھید بنائے
یہ موسیقی، نامردی کی یہ موسیقی، اِتنی بے تاثیر ہے جیسے
گھسے پٹے اِک ساز پہ کوئی بے رنگی کے گیت سنائے
باہر دُنیا ـــــ سرکش اور مغرور یہ دُنیا
طاقت کے مُنہ زور نشے میں اپنے رُوپ دکھاتی جائے!!